

## پیر صاحب \*

خورشید رضوی

ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب کا نام میں نے سب سے پہلے اپنے استاد مرحوم ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب سے سنا۔ ڈاکٹر صوفی صاحب مولانا اصغر علی روحی کے فرزند اور ان کے علمی جانشین تھے۔ عربی کے میدان میں ان کی زبان سے کسی کے لئے تعریفی کلمات کو ان کے تلامذہ سند کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ پیر صاحب کو دیکھنے سے قبل ہی میں گویا غائبانہ ان کا مرید ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ ملاقات کے بعد اس ارادت میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔

پہلی ملاقات کا شرف مجھے کوئی بارہ برس قبل ادارہ تحقیقات اسلامی ہی کے توسط سے حاصل ہوا۔ ادارہ ان دنوں سوک سنٹر والی عمارت میں تھا۔ پیر صاحب صغانی کی „العباب الزاخر“ پر اپنے یادگار کام کے سلسلے میں بڑی پابندی سے روز ادارے کے کتب خانے میں آتے تھے۔ وہیں یہ سعادت حاصل ہوئی۔ میں ان دنوں قدیم عربی ادب پر کچھ کام کر رہا تھا۔ نکلسن نے دور جاہلیت میں شاعر کی حیثیت سے متعلق لکھتے ہوئے ایک حوالہ میدان کی „مجمع الأمثال“ کے جرمن ترجمے کا دیا تھا جو سامنے نہ تھا اور یہ پتہ چلانا ازحد دشوار ہو رہا تھا کہ میدان نے یہ بات اس ضخیم تصنیف میں کہاں

\* اس مضمون کا ابتدائی خاکہ، فکرونظر، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

لکھی ہے۔ میں نے اس الجھن کا ذکر پیر صاحب سے کیا تو فی الفور انہوں نے فرمایا یہ بات غالباً فلاں مثل کے تحت آتی ہے اور مثل کے الفاظ دہرا دیتے۔ پھر فوری طور پر کتب خانے سے، ”مجمع الأمثال“ نکال کر مجھے وہ عبارت دکھا دی۔ میں ان کے استحضار علمی اور قوت حافظہ پر حیران رہ گیا۔ ایک آدھ اور مسئلے پر بھی انہی دنوں استفسار کا اتفاق ہوا اور ایسا ہی شافی جواب ملا۔ ان کی علمیت جو پہلے، ”شنیدہ“ کے ذیل میں آتی تھی اب، ”دیدہ“ کے درجے تک پہنچ گئی۔

۱۹۸۵ء میں جب مجھے خود ادارے سے وابستہ ہو جانے کا موقع ملا تو پیر صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ جو چیز ان کے علم سے بھی زیادہ متاثر کرنے والی ہے وہ ان کی شخصیت اور کردار ہے۔ اسلام آباد کی بیخ بستہ صبحوں میں اس پیرانہ سالی۔ (پیر صاحب کی پیدائش ۱۹۰۴ء کے لگ بھگ کی ہے)۔ کے باوجود وہ پابندی سے ہر روز کچھ۔ فاصلہ پیدل اور کچھ۔ بسوں میں طے کر کے ادارے کا کتب خانہ کھلتے ہی تشریف لے آتے تھے اور کسی سے کوئی غیر ضروری بات کتنے بغیر ایک گوشے میں، جو ان کے لئے مخصوص تھا، بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کی پابندی وقت سے شاید بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی ہوئی ہو کہ وہ ادارے میں ملازمت کرتے ہیں حالانکہ مختلف سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہنے کے بعد اب ایک مدت سے وہ ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ان کے تمام تر علمی مشاغل خالص رضاکارانہ ہیں۔

پیر صاحب کی شخصیت میں چونکہ مجھے ایک خاص جاذبیت محسوس ہوتی تھی اور ان کی صحبت میں دل کی کشادگی کا

احساس ہوتا تھا اس لئے میں اکثر ان کے پاس کچھ وقت گزارتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں کم آمیزی کے ساتھ ساتھ دل آویزی بھی ہے۔ کوئی نہ آئے تو وہ مدتوں خاموش اور خود مست بھی رہ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی آ بیٹھے تو کام چھوڑ کر پوری محبت و شفقت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کم از کم میرا تجربہ یہی رہا ہے کہ ہمیشہ میں نے خود ان سے اجازت لی ہے۔ انہوں نے کبھی بھی مجھے تنگی وقت کا احساس نہیں دلایا۔

ان گاہ گاہ کی مجالس میں اگرچہ عموماً کوئی معین موضوع زیر بحث نہیں ہوتا تھا تاہم عربی زبان سے متعلق علمی نکات کسی نہ کسی مناسبت سے پیر صاحب کی زبان سے پھوٹتے رہتے تھے۔ جو انہوں نے نہ جانے کتنے ضخیم دفتر چھان کر مہیا کئے تھے اور مجھ سے ایسے خوش نصیب نکھٹو کو مفت حاصل ہو جاتے تھے۔

کسی دن باتوں باتوں میں فرماتے، ”قوم“ کا لفظ عربی میں مردوں کے لئے خاص ہے عورتوں کا تصور اس میں شامل نہیں، چنانچہ شاعر کا شعر دیکھئے :

ولا أدری ولست إخالُ أدری

أقومُ آلُ حِصْنٍ أَمْ نِسَاءُ

اور سب سے بڑھ کر دیکھئے کہ خود قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے :  
 ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ“ (۱۱/۳۹)

کسی دن ارشاد ہوتا کہ وزن، ”فِعَال“ کی جمع اگر مذکر ہو تو ”أَفْعِلَةٌ“ آتی ہے اور اگر مؤنث ہو تو ”أَفْعُلٌ“۔ لفظ ”لِسَان“ بروزن ”فِعَال“ چونکہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لہذا اس کی جمع بھی دونوں طرح جائز ہے یعنی ”أَلْسِنَةٌ“ اور ”أَلْسُنٌ“۔ کبھی

،،میت“ اور میت“ کے باریک فرق پر روشنی ڈالتے کہ ،،میت“ کا اطلاق صرف مردے پر ہوتا ہے جیسا کہ اعثنیٰ کے شعر میں ہے ( یہ شعر پیر صاحب کو بہت پسند ہے ) :

لَوْ أُسْنَدَتْ مَيْتًا إِلَىٰ نَحْرِهَا

عَاشَ وَلَمْ يُحْمَلْ إِلَىٰ قَابِرِ

جبکہ ،،میت“ میں یہ مفہوم بھی موجود ہے اور اس کے علاوہ زندہ پر بھی اس کا اطلاق باعتبار انجام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں آتا ہے :

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ (۳۰/۳۹)۔

ایسے موقع پر ،،میت“ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کے فرق کے بارے میں کسی نے یہ دو شعر نظم کر دیئے ہیں :

أَيَا سَائِلِي تَفْسِيرَ مَيِّتٍ وَمَيِّتٍ

فَدُونِكَ قَدْ أُدْرِكْتَ إِنْ كُنْتَ تَعْقِلُ

فَمَنْ كَانَ ذَا رُوحٍ فَذَلِكَ مَيِّتٌ

وَمَا الْمَيِّتُ إِلَّا مَنْ إِلَى الْقَبْرِ يُحْمَلُ

یہ شعر سنا کر غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ پہلے شعر میں ٹھیک یاد نہیں آ رہا ،،قَدْ أُدْرِكْتَ“ کے الفاظ تھے یا ایسے ہی کچھ۔ اور الفاظ۔ یہ وضاحت پیر صاحب کے مزاج میں علمی احتیاط کی نشان دہی کرتی ہے۔

ایک روز ،،لُثْغَةُ“ یعنی زبان کے اس عیب پر بات چل نکلی جس میں کوئی شخص کسی خاص حرف کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ پیر صاحب نے سنایا کہ ایک شخص ،،ر“ ادا نہیں کر سکتا تھا لیکن تھا بڑا زبان دان اور قادر الکلام۔ کسی نے اس کی کمزوری کو بھانپ کر اس سے کہا کہ یہ پیغام کسی کو پہنچا دو کہ :

،،أمر أمير الأمراء أن يُحْفَرَ بِئْرٌ فِي طَرِيقٍ لِيَرِدَ عَلَيْهِ الْوَارِدُ وَالصَّادِرُ»۔  
 اس نے جواب دیا ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا کہ :  
 ،،حَكَمَ حَاكِمُ الْحُكَّامِ أَنْ يُنْبِتَ قَلْبًا فِي سَبِيلِ لَيْسْتَقَى مِنْهُ الْجَائِي وَالذَّاهِبُ»۔

کبھی اپنے استاد محترم ، مولانا محمد عالم آسی کی بے پناہ علمی استعداد کے ساتھ ساتھ نام و نمود سے ان کی نفرت کا ذکر کرتے ، ان کی تصانیف پر روشنی ڈالتے اور عربی زبان پر ان کی زبردست قدرت سے متعلق کچھ واقعات سناتے (پیر صاحب اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ انہی کے مداح و معترف نظر آتے ہیں )۔

ایک زمانے میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے بعض احباب نے طے کیا کہ پیر صاحب سے روزانہ عربی ادب کی کسی بنیادی کتاب کا درس لیا جایا کرے۔ چنانچہ پیر صاحب نے مبرّد کی کتاب الکامل کی تدریس شروع کی۔ ان اسباق میں میں بھی شامل رہا لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔

پیر صاحب کو آغاز ہی سے ورزش اور پیراکی سے شغف رہا ہے۔ ہر چند کہ اب ان کے قوی بھی اضمحلال کی طرف مائل ہونے لگے ہیں تاہم ماضی کی سخت کوشی کا اثر ان کے مزاج پر آج بھی نظر آتا ہے۔ ان کی طبیعت میں بلا کا استقلال ہے۔ وہ پانی کے اس مسلسل ٹپکنے والے قطرے کی طرح سرگرم عمل رہتے ہیں جو بالآخر پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ جس زمانے میں پابندی سے ادارے میں آیا کرتے تھے تو صورت یہ تھی کہ بخار کی کیفیت ہے مگر پیر صاحب باقاعدگی سے آ رہے ہیں اور کام مسلسل جاری ہے۔ ماہ رمضان میں پابندی صوم کے باوجود معمولات پر کوئی اثر نہیں۔ طبیعت میں انتہائی تحمل اور ٹھہراؤ۔ جلد بازی نام کو نہیں۔ تکلف اور تصنع

سے بری - زندگی کے بارے میں رویہ نہایت مثبت اور حقیقت پسندانہ -  
 حالات سے دل برداشتہ یا مشتعل ہونا انہوں نے سیکھا ہی نہیں -  
 حالات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں یہ جوئے کھستان کی طرح اپنا  
 راستہ نکال ہی لیں گے - وہ جوئے کھستان جس کے بارے میں علامہ  
 اقبال فرما گئے ہیں :

رُکے جب تو سیل چیر دیتی ہے یہ

پھاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

پیر صاحب ,,کوشش برے ہودہ بہ از خفتگی ,, کے قائل معلوم ہوتے  
 ہیں - وہ صحتِ جسمانی کا نسخہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ بیٹھو مت ،  
 آخر تک متحرک رہو - ہر حال میں متحرک رہو خواہ آرام ہو یا  
 تکلیف - کام کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ بعض لوگ عمر کی  
 ناپائیداری کو دیکھ کر کام سے جی اُچاٹ کر لیتے ہیں اور یہ خیال  
 ظاہر کرتے ہیں کہ موت سر پر کھڑی ہے کام سے کیا حاصل - پیر  
 صاحب کا خیال عین برعکس ہے - ان کا کہنا ہے کہ کام اسی لئے کرنا  
 ضروری ہے کہ موت سر پر کھڑی ہے -

پیر صاحب کے کردار میں دوئی کو دخل نہیں - ان کے ظاہر و  
 باطن کے درمیان خلیج نہیں - جو زبان سے کہتے ہیں کامل دیانت  
 داری سے اسی پر یقین رکھتے ہیں - شاید اُن کا حافظہ اسی لئے اتنا  
 اچھا ہے کہ وہ جو کچھ زبان سے کہہ دیں اس کی پاسداری کا  
 انہیں از حد خیال رہتا ہے - کہہ کر بھول جانا ان کی سرشت سے دور  
 ہے - معاملات کی صفائی میں آئینہ کردار ہیں - پنسل کا ایک ٹکڑا  
 بھی کسی کا اگر ان کے پاس رہ جائے تو چل کر جائیں گے اور اسے  
 دے کر آئیں گے - کسی سے کچھ مانگنا ان کی طبیعت سے کوئی  
 مناسبت ہی نہیں رکھتا - ادارے میں ان کی آمدورفت کے زمانے میں

میں نے دیکھا کہ سخت سردی کا موسم ہو، جوڑوں میں درد ہو، یہ ادارے سے پیدل ہی چل کر چوک تک جائیں گے۔ ازخود اگر کوئی عقیدت مند سواری ٹھہرا لے تو دوسری بات ہے یہ ہرگز کسی سے نہ کہیں گے۔ انہوں نے زندگی کے مسائل کو کبھی لفٹ نہیں دی لہذا لفٹ لینے کے بھی قائل نہیں۔ ہر روز کاغذ قلم سب کچھ، اپنا ساتھ لاتے تھے ایک ورق بھی کہیں سے لینا پڑ جائے تو ان کے دل پر بار ہوتا۔ ہاں مگر میں نے کئی بار پیر صاحب کے کاغذ پر ہاتھ صاف کیا اور دل پر کوئی بار بھی محسوس نہ کیا کیونکہ کچھ دینے وقت پیر صاحب کی آنکھوں میں سبک سبک سی ایک روشنی ہوتی ہے جو لینے والے کے دل تک سرایت کر جاتی ہے۔ زہیر نے کیا خوب کہا ہے:

تراہ اذا ما جئته ، متهللاً

کاتک تعطیہ الذی انت سائلہ

،، اس کے پاس تم آتے ہو

تو مسرت کی چمک اس کے چہرے پر پاتے ہو

گویا جو کچھ تم اس سے مانگ رہے ہو

مانگ نہیں رہے بلکہ اُسے دے رہے ہو “

پیر صاحب نے ادارہ تحقیقات اسلامی میں سترہ برس اسی استقلال کے ساتھ صفائی کی ،،العباب الزاخر، کی تحقیق متن میں گزارے اور اسے بارہ جلدوں میں جو چھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں، مکمل کر دیا۔ یہ ایک ٹیم کا کام تھا جو ایک فرد نے انجام دیا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی تک تحقیق متن کی اہمیت تو درکنار، اس بات کا شعور بھی عام نہیں ہو سکا کہ یہ کام ہوتا کیا ہے۔ عموماً لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ کسی پرانے مخطوطے کو ذرا صاف کر کے لکھ دینے کا نام ایڈیٹنگ یا تحقیق متن ہے۔ چنانچہ

سوچتے ہیں کہ مُتون کے محقق برسوں کیا کرتے رہتے ہیں جبکہ کتابیں تو لکھنے والے لکھ گئے۔ انہیں یہ سمجھانا کس قدر دشوار ہے کہ بسا اوقات ایک کتاب کی تصنیف میں اتنا وقت اور محنت صرف نہیں ہوتی جتنی ایک قدیم مخطوطے کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

پیر صاحب نے یہ جانکاه کام صلہ و ستائش، سود و زیاں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر کیا اور اس پر عمر عزیز کا ایک طویل حصہ صرف کر ڈالا۔ اگر کوئی ناشناس کبھی ان سے پوچھتا کہ آپ کیا کام کر رہے ہیں؟ تو کمال متانت سے صرف اتنا کہہ دیتے، ”یہ ایک ایسا کام ہے جو میں آپ پر واضح نہ کر سکوں گا۔“

اس طویل کام کی انجام دہی کے دوران جو مصادرِ لغت، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے کتب خانے میں پیر صاحب کے زیرِ استعمال رہے ان کے حواشی پر جابجا انہوں نے بعض ملاحظات و تصحیحات اپنے قلم سے درج کر دی ہیں اور اکثر باریک خط میں، ”حسن“ لکھ دیا ہے جو ان کے مختصر دستخط ہیں۔ اس وقت ان ملاحظات کی علمی قدر و قیمت پر گفتگو ممکن نہیں۔ اگر ان تمام کتب کو، جو پیر صاحب کے زیرِ استعمال رہیں، کھنگال کر ان ملاحظات کو یکجا کر لینے کا اہتمام کیا جا سکے تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی۔ اس وقت نمونہ مشترک از خروارے کے طور پر صرف، ”لسان العرب“ کو لے لیجیئے۔ آئیے بے ترتیبی سے اسے کہیں کہیں سے کھول کر دیکھیں۔

مادہ م ص ح کے تحت ابن منظور نے لکھا ہے :

”مَصْحَ بِالْشَيْءِ يَمْصَحُ مَصْحًا وَمَصْحًا : ذَهَبٌ : قَالَ ذُو الرِّمَّةِ :

وَالهَجْرُ بِالْآلِ يَمْصَحُ “

گویا ذو الرّمہ کا پورا شعر یا پورا مصرعہ مذکور نہیں بلکہ صرف وہ



ٹکڑا نقل کیا گیا ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ پیر صاحب نے اس کے حاشیے پر لکھا ہے :

،تمام البیت وصوابہ :

وَيَدَاءُ مِقْفَارٍ يَكَادُارِ تَكَازُهَا

بِأَلِ الضُّحَى وَالهِجْرِ بِالطَّرْفِ يَمْصَحُ ،

گویا ایک تو مکمل شعر تلاش کر کے لکھا ہے ، کیونکہ یہ شعر جب تک مکمل سامنے نہ ہو اس غلط فہمی کا اندیشہ ہے کہ ،،مصحح“ کا فاعل ،،الہجر“ ہے۔ حالانکہ یہاں فاعل مصرعہ اول میں لفظ ،،ارتکاز“ ہے۔ دوسرے یہ کہ ابن منظور کی روایت میں ،،بالطرف“ کی جگہ ،،بالآل“ درج ہو گیا ہے جس کی تصحیح پیر صاحب نے فرما دی۔

مادہ ،، ذ ا ج “ کے تحت لسان العرب کے مطبوعہ نسخہ میں الفراء کے حوالے سے لکھا ہے :

،،ذَيْجٌ وَضَيْمٌ وَصَيْبٌ وَإِذَا أَكْثَرَ مِنْ شُرْبِ الْمَاءِ ،

پیر صاحب نے حاشیے پر تصحیح کرتے ہوئے ،،ضَيْمٌ“ ضاد معجمہ کے بجائے ،،صَيْمٌ“ صاد مہملہ سے لکھا ہے۔ اعتماد کے ساتھ اس ایک نقطے کی درستی کرنے کے لئے بلاکی نکتہ رسی اور لغاتِ عرب پر زبردست عبور درکار ہے۔

مادہ ،، و د ج “ کے تحت اسی مطبوعہ نسخہ میں ہے :

،،والوريدان التَّبْضُ وَالتَّفْسُ ،

پیر صاحب نے ،،لِلتَّبْضِ“ لکھ کر الأزہری کی تہذیب اللّغة جلد ۱۱ کے صفحہ ۱۶۱ کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ،،لِلتَّبْضِ“ کی جگہ ،،التَّبْضِ“ پڑھنے سے مفہوم کس قدر مبہم تھا۔ یہ تحقیقِ متن کی فروگذاشت ہے۔ اس سے تحقیقِ متن کی اپنی

اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور اس ژرف نگاہی کا بھی سراغ ملتا ہے جو خود پیر صاحب نے تحقیقِ متن میں صرف کی ہے۔

تہذیب اللّٰغۃ کا ذکر آیا ہے تو مادہ „ف ر ش“ میں یہاں بھی

ایک مثال دیکھتے چلیں۔ مطبوعہ متن میں درج ہے :

„أفرشتِ الفرسُ إذا استأنتُ“

پیر صاحب نے حاشیہ پر لکھا ہے :

„الصوابُ استأنتُ أي طلبتُ أن تُوتی“

پھر اسی مادے میں کچھ۔ آگے چل کر درج ہے :

„وقال السَّمَاخُ“

پیر صاحب نے لکھا ہے :

„هو لذي الرّمة ؛ راجع ديوانه : ۱۳۷“

اندازہ کیجیئے کہ پیر صاحب نے کس عرق ریزی سے لغت کی امہات الکتب کو کھنگالا ہے اور تقابلی مطالعے کے بعد ہر کتاب میں طباعت یا تحقیقِ متن یا خود مصنف کے التباسات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

„العباب الزّآخر“ میں پیر صاحب کے منہجِ تحقیق کے بارے میں

اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر اعتبار سے بین الاقوامی معیار پر

پورا اترتا ہے۔ پیر صاحب نے تمام مسودہ ، مکمل زیر زبر کے ساتھ۔

اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ جہاں کسی ناخواندہ حصے کو کسی دوسرے

مصدر کے موازنے سے درست کیا ہے ، یا ورق میں حوالہ دیا ہے۔ جہاں

کسی لفظ کا اضافہ کیا ہے ، معروف طریقے کے مطابق اسے حاضرین

(کھڑے بریکٹ) میں رکھا ہے۔ اگر کہیں متن توضیح طلب ہے تو

حاشیہ میں توضیح فراہم کی ہے۔ اگر اس سلسلے میں کسی اقتباس

کی ضرورت ہوئی ہے تو اقتباس مع حوالہ لایا گیا ہے۔ اگر کسی نکتے

پر سربرآوردہ لغت نویسوں میں کوئی اختلاف یا باہم ایک دوسرے پر کوئی تبصرہ قابل ذکر ہے تو اس کا ذکر بھی حواشی میں لایا گیا ہے۔ لیکن اس تمام کام میں غیر ضروری اطنباب سے گریز کیا گیا ہے۔ اور حواشی کو ہر ممکن حد تک ہلکا رکھا گیا ہے۔

„العباب الزاخرہ“ کی تحقیقِ متن میں پیر صاحب کا زاویہ نگاہ خالصتاً علمی و معروضی ہے۔ چنانچہ انہوں نے صفانی کے مالہ کے ساتھ ساتھ ماعلیہ بھی بے تکلف بیان کیا ہے۔ باب الہمزۃ کے ساتھ مطبوعہ مقدمے میں کئی مثالیں ایسی نقل کی گئی ہیں جن میں، پیر صاحب کے خیال کے مطابق، صفانی نے حوالہ دینے بغیر زمخشری اور یاقوت کی تحریروں سے جوں کے توں اقتباس لے لئے ہیں یا ان میں تھوڑا بہت رد و بدل کر دیا ہے۔ یہ چیز نہ صرف پیر صاحب کی معروضیت کا پتہ دیتی ہے بلکہ اس جانکاہ محنت کا بھی سراغ فراہم کرتی ہے جو انہوں نے، العباب، کے اندراجات کا دیگر مصادر لغت سے بدقتِ نظر موازنہ کرنے میں صرف کی ہے۔

پیر صاحب نے صفانی کے بعض التباسات کا ازالہ بھی کیا ہے مثلاً صفانی نے کہا ہے کہ „جُبُّب“ مدینہ منورہ کے نواح میں ایک چشمہ کا نام ہے۔ پیر صاحب نے یاقوت الحموی کے حوالے سے یہ وضاحت کی ہے کہ دراصل یہ چشمہ یمامہ کے قرب و جوار میں ہے۔ پھر مزید جستجو کر کے یہ بھی بتایا ہے کہ صفانی کو غلط فہمی شاید „ابن دُرید“ کی „جمہرة اللغة“ سے ہوئی ہے جس میں اس نے „جُبُّب“ کے ذیل میں مندرجہ ذیل شعر سے استشہاد کیا ہے :

یا دار سلمیٰ بجنوبِ یترِبِ

بِجُبُّبٍ وَ عَن یَمِینِ جُبُّبِ

„یترِب“ تائرِ مثناء سے، یمامہ کے قریب ایک مقام ہے اور وہی اس

شعر میں مراد ہے۔ صغانی کو التباس ہوا اور اسے „یثرب“، نائے مثلثہ، سے تصور کرتے ہوئے „جُبُجُب“ کا محل وقوع مدینہ منورہ کے نواح میں قرار دے دیا۔ اہل نظر خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس طرح کی ایک تصحیح کے لئے علم کی کتنی گہرائی، مطالعے کی کتنی وسعت اور کس قدر جانکاه محنت درکار ہے۔ پیر صاحب نے چھ ہزار سے زائد صفحات پر ایسی ہی محنت صرف کی ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ پیر صاحب نے اپنے علمی سفر کے آغاز میں بھی تحقیقِ متن کا ایک اہم کام سرانجام دیا تھا جو ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ یہ شہرزوری کی „نزهة الأرواح و روضة الافراح“ کے اس حصے کی ایڈیٹنگ تھی جو مسلم فلاسفہ سے متعلق ہے۔ یہ پیر صاحب کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا جس پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۳۸ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔

تحقیقِ متن کے علاوہ پیر صاحب کا خاص میدان ترجمہ رہا ہے اور بیشتر توجہ کتبِ تصوف پر رہی ہے۔ ان کے قلم سے کتاب اللُّمَع، الإبریز، الرسالة القشیریة، التعرف اور لمحات جیسی کتب کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ آلوسی کی ضخیم تصنیف بلوغ الارب کا ترجمہ بھی بطور خاص قابلِ ذکر ہے۔

سامعین! پیر صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کی حکایت لذیذ تھی لہذا کسی حد تک „دراز تر گفتم“ کے ذیل میں جا پڑی۔ اگرچہ ان کے اوصافِ حمیدہ کی وسعت کے پیش نظر یہ ہنوز تشنہ و مختصر ہے۔ تاہم اس احساس کے ساتھ کہ آج کی بزم میں مجھ سے بہت بہتر لوگوں کو اظہارِ خیال کرنا ہے، ہمیں اپنی معروضات کو سمیٹنا ہوں اور اختتام ابوالعلاء المعری کے ایک شعر پر

کرتا ہوں جو ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب کو دیکھ کر یاد آنا  
چاہیئے :

وَإِنِّي وَإِنْ كُنْتُ الْأَخِيرَ زَمَانُهُ

لَا تَبِيَّ بِمَا لَمْ تَسْتَطِعْهُ الْأَوَائِلُ

”میں وہ ہوں کہ ہر چند میرا زمانہ بعد کا ہے

مگر میں وہ کام کر دکھاؤں گا جو اگلوں سے نہ بن پڑے “

★★★